گلوبل سنڈروم؛ وبائے بے درماں کا تنقیدیہ

Global Syndrome; The Critique of Incurable Pandemic.

ڈاکٹر سعادت سعید،
ممتاز پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Language is a mysterious reality. Its pivotal point is sign or word. Sign contains abstraction. Writers use these signs for their indications, hints and suggestions. Through these signs speakers of various languages can reflect universe around them on the canvases of their minds. A poet, through his imagination based on these signs can foresee the world of possibilities. We can depict our aims through writing and speaking these signs. Poets and writers claim that their creative or literary works could be interpreted dimensionally. More over anyone by implying his or her mind can also interpret them in a different way. Associations of ideas are capable of visualizing things in parts and totality. If any theorist surpasses the real aims of writers and poets, it could be said he is not fair to his deeds. Various critics belong to the traditions of modernism and postmodernism do not judge fairly the texts under their studies.

کلیدی الفاظ۔ محمد حسین آزاد، جیمز جوائس، افتخار جالب،

متن کے تاریک اندھے غاروں سے روشنی میں آنے والے نوادرات پر جدید تفسیری مافیا کی تمام تر گڈ ول کا انحصار ہے۔ رائج الوقت فیشنی نقادوں نے مصنف کے حقیقی ارادی معنی کو غتر بود کرنے کا بالالتزام قصد کر رکھا ہے۔ ان کی پرزمی منطق قارئین کو کسی رنگ پر ٹکنے نہیں دیتی۔ یہ نقاد مفہوم کی ہر قسم کی الجھنوں کو سلجھانے پر ہمہ وقت آمادہ ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے فلسفہ الہیات، جیمز جوائس کی فنیگنز ویک، افتخار جالب کی قدیم بنجر، پر توجہ دینے سے گریز ان کی دانش کی پول کھولی کا مظہر ہے۔ دو اور دو چار کی منطق سے ادب کی گرہیں کھولنے والے تجربیت پسند علامت، استعارے، تمثیل، متھ وغیرہ کے بستوں کی کشاد گیاں روایتی مفہوم

فہمی کے وسیلے سے کرنے کے درپے رہے ہیں۔ "جنون بکی" (۱) بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی، دیوان غالب، ہر اس شاعر اور دانش ور کا حق خاص ہے کہ جو مروجہ نظاماتی قدروں کے دائرے میں اسیری اور گھٹن کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لیے نقاد اگر ان کے متون کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں تو انہیں کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ اپنی اپنی دکانداری چمکانے کا ہر شخص کو حق ہے۔ مزید برآں اپنی دوچاری منطق کی چارپائی پر لٹا کر وہ کسی متن کی ٹانگیں کھینچ کر دراز کر سکتے ہیں یا دراز ٹانگوں کو کاٹ کر چارپائی کے برابر کر سکتے ہیں۔ ویسے وہ ایسا کرتے ہوئے سر اڑانے کا کام بھی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔

زبان ایک پر اسرار حقیقت ہے۔ اس کا دارو مدار تجریدی نشانوں پر ہے۔ ہم ان کی مدد سے پوری کی پوری کائنات کو اپنے دماغ کے کینوس پر اتار سکتے ہیں۔ تا آنکہ کہ کھرے بستر پر دراز شاعر یا مفکر گلشن ناآفریدہ کا عندلیب ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے۔ الفاظ انسانوں کی مشاہداتی، جذباتی اور فکری مسافتوں کے نشانوں کے طور پر سمعی اور بصری طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ شاعروں نے دعوے کیے ہیں کہ ان کے اشعار کئی کئی اطراف کے حامل ہوتے ہیں۔ ان اطراف کو یا شاعر خود واضح کرتے ہیں یا پھر وہ قاری کی دست برد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نفسیات میں خیالی تلازموں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ انسانی دماغ ان کی مدد سے کائنات گیری کا مدعی ہو سکتا ہے۔ سکنا یا امکان "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" (۲) کا شاخسانہ ہے۔ ایسے میں ڈی کنسٹرکشن کا فلوک قارئین کو جن حدود تک لے جاتا ہے وہ آئندہ زمانوں میں مزید وسعتوں سے آشنا ہو سکتی ہیں۔ اس طریقے سے معنی کی متعدد پرتوں کو طشت از بام کیا جاتا ہے۔ اس میں مصنف کے ارادے اور زبان، تصاویر اور خیالات کی روائتوں سے بھی حسب استطاعت استفادہ ممکن ہے۔ ایسے میں ژاک ڈریڈا کی نظریہ بازی تخصیصی مطلب بر آری کی مرکزیت سے ماورا نہیں ہوتی۔ ڈی کنسٹرکشن کے تنقیدی طریق کار میں ایقان، ایمان، روایت پرستی کی مناطق پر ضرب ہائے کاری لگائی جاتی ہیں یوں انسان اپنی لسانی جڑوں سے باہر جانے کی مساعی جدیدہ پر راضی و قانع ہونے پر فخر محسوس کر سکتا ہے۔ جدید صنعتی معیشت کے فروغ کے لیے یہ امر ضروری تھا۔ تاکہ اس کے نتیجے میں ہم تمام انواع کی صنعتی اشیا کے خریدار بن سکیں۔ مثلاً ماضی میں ہم دنداسے، کوئلے، مسواک یا کسی دوسرے ذریعے سے دانت صاف کرتے تھے اب ان کی بجائے مشینی برش اور انواع و اقسام کی ڈینٹل کریموں کے خریدار بن چکے ہیں ۔ یہ عمل صارفیتی زندگی کے ہر پہلو میں جاری و ساری ہے۔ روایتی انسان کی ڈی کنسٹرکشن صارفیت کے نئے طور طریقوں کی مدد سے جدیدی اور مابعد جدیدی انسان کی نئی شکلوں کو سامنے لا چکی ہے۔ ایسے میں نذیر احمد (ابن الوقت)، فرحت اللہ بیگ (صاحب بہادر)، اکبر الہ آبادی (ہوئے پیدا ہو ٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر)، علامہ اقبال (لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی) وغیرہ وغیرہ جیسے ادبی پیغامات اپنی حقیقت کھو چکے ہیں کہ ڈی کنسٹرکشن کے نئے کلمے نے ہمیں مذہب صارفیت کی راہیں دکھا دی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں

اس ڈی کنسٹرکشن کا بانی و مبانی لارڈ میکالے تھا جس کی تعلیمی پالیسی کے خلاف شدید رد عمل کے باوجود ہم تشکیک کی راہ سے اپنے اکثر روایتی طور طریقوں سے دستبردار ہو چکے ہیں۔

پاکستان اپنی تمام تر مابعد الطبیعیاتی مطلقیت کے باوجود مادیاتی تمدن یا صارفیاتی تحلل کے زیر اثر عالمایا اور مادیایا گیا ہے۔ ہماری سماجی، انتظامی، قانونی، علمی، ادبی، فکری، فنی معاملتوں میں گلوبل دیمک کے جرثومے کھربوں کی تعداد میں پرورش پا رہے ہیں۔ بچوں کے کارٹونوں سے لے کر فلسفیانہ صحیفوں تک جدھر دیکھیئے مادی اور صارفی کلچر کے مسلط کردہ سلاسل اپنی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ ہمارے قصبہ نما شہر گذشتہ نصف صدی سے ماڈرن عالمی شہروں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ پلازے، شاپنگ مالز، آرکیڈیمز، سیون سٹار ہوٹلز، نئے تعمیری عجوبے، بین الاقوامی اسفار، دساوری جامعات سے حصول تعلیم و تربیت اور ان کے ساتھ وابستہ ثقافتی یلغاریں مقامی انسانوں کی نفسیاتی ٹونز میں تواتر سے تبدیلیاں پیدا کر رہی ہیں۔ پاکستان میں گلوبل ولیج کے اثرات نمایاں سے نمایاں تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں نمایاں ترین کرنے کے لیے عالمی سطح کے ادبی میلے، سیمینارز، کانفرنسیں منعقد کروائی جا رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری ثقافتی زندگیاں ماڈلائی گئی ہیں۔ کوٹھیوں، کاروں، فرنیچروں، درون خانہ آرائشوں، بیوٹی پارلروں، طلائی زیوروں کے نت نئے ماڈلز ہمارے متوسط اور بالائی طبقوں کی خوابگونیوں کے مظہر بن چکے ہیں۔ کانفرنسوں میں مدعو کردہ کلیدی خطیبوں کے جوہری پیٹرنز سرمایہ پرست ماحول فروغی سے عبارت ہیں۔ سرمایہ پرست ماحول ضروریات پیدا کرنے اور پھر ان سے سرمایہ حاصل کرنے کے اعمال پر سختی سے کاربند ہے۔

مغربی فلسفوں کے رسیا ہمارے بعض دانشوروں نے اپنے مضمونوں، مقالوں، تقریروں کے وسیلوں سے نئی ماڈلائی دانشوں کو ہمارے قارئین کی ضرورت بنانے کا کام بطریق احسن انجام دیا ہے۔ انہوں نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ طبقاتی سماج میں عوام کا حق غصب کرنے والے لٹیروں اور ڈکیتوں کی رونمائیاں نہ ہو سکیں۔ سماجی اتھل پتھل، نظامی تبدیلی، انقلاب جیسے الفاظ ان کی لغتوں سے غائب ہو چکے ہیں۔ ترقی پسندی کا مطلب سرمایہ جمعی کی تبلیغ و حفاظت ہو گیا ہے۔ بازاروں میں اشیا کے انقلابی ڈیزائنز بک رہے ہیں۔ نت نئی ساختوں کی متنوع چیزوں کی فروختنیاں زور و شور سے جاری و ساری ہیں۔ ایسے میں طنطنہ باز دانشوروں نے مغربی تھوریز بیچنے کی دکانیں قائم کر لی ہیں۔ یوں گلوبل سنڈروم، وبائے بے درماں کی طرح ہماری زندگیوں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کیے جا رہا ہے۔ ایسے میں ان رویوں کا تنقیدیہ وقت کی اشد ضرورت بن چکا ہے۔

اردو ادب کے قارئین کلاسیکیت، رومانویت، ترقی پسندی (مارکسزم) اور جدیدیت (مع وجودیت) کے تصورات سے مانوسیت کے ثمر چکھ ہی رہے تھے کہ مغرب سے اٹھی ساختیات اور ڈی کنسٹرکشن کی نظریاتی آندھی نے انہیں راہ ہی میں آلیا۔ انہیں ماسکو، پراگ، جنیوا، شکاگو، آکسفورڈ، کیمبرج، ییل وغیرہ کے دبستانوں

کے، دانش نمائی کرنے والے دیووں کے سایوں نے آلیا۔ ان کی لسانی، مذہبی اور نظریاتی گٹ مٹیوں نے ایسے گلہائے سیمیا کھلائے کہ ہمارے طوطا عقل دانش وروں نے دیو بو، دیو بو کے نعرے لگاتے ہوئے ان کے سونے اور چاندی کے باسنوں سے سجے دستر خوانوں کی مکھیاں بننے کو ترجیح دینا شروع کی۔ تب اچانک کھلا کہ ہماری ثقافتی جمع پونجیوں کو سات سمندر سے آنے والے دیو سایوں نے "غٹر غپ" کر لیا ہے۔ یعنی غٹر علحدہ سنائی دے رہی تھی اور گوں علحدہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے قومی، قومیتی، اکثریتی و اقلیتی نفسیات کے مارے معاملات شدت اختیار کرنے لگے۔ بندے گنے گئے، تولے نہیں گئے۔ ملکوں ملکوں بٹوارے ہوئے، شہروں شہروں بٹوارے ہوئے، گھر گھر بٹوارے ہوئے۔ ایسے میں سات سمندر پار کے دیو مزید مستحکم ہو کر ہمارے سروں میں آبیٹھے۔ ایلیمنٹری کورس، پرائمری کورس، میٹرک کورس، انٹر کورس، بی اے کورس، ایم اے کورس ہر جا آدم بو، آدم بو کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ گھٹ گئے آدم بڑھ گئے سائے۔ ان کورسوں اور ان کے ڈسکورسوں میں سے آدم غائب ہونے لگے تا آنکہ مفقود ہو گئے۔ چہار جانب بندر نظر آنے لگے یا طوطے۔ نقالی کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگا۔ طوطا ڈسکورسی میں صرف ایسی آوازوں کو پھلنے پھولنے کی اجازت ملی کہ جو حسب ضرورت ان دیووں نے ان کے حلقوں میں منتقل کی تھیں۔ ان متعینہ آوازوں کو تکلم یا خطابوں کی بنیادیں بنایا گیا۔ علمی اعتبار سے ان کے مخاطبوں کو ساختیاتی ڈسکورس کا نام دیا جانے لگا۔ یہ ڈسکورس یا گٹ مٹیاں آگے چل کر پس ساختیات یا مابعد جدیدیت کے تصورات کا حصہ بقدر جثہ بن گئیں۔ یہ بندر کبھی افقی کودے کبھی عمودی۔ طوطوں نے اپنی ٹیں ٹیں آوازوں میں دال مدلول کرتے کرتے چوریاں کھانا شروع کیں۔ علم کے نشے میں طوطا بندری سروری رقص ہوئے۔ ادب اور دانش کا مقصد خوشی، شادمانی اور تازگی کی تقسیم کو قرار دیا گیا۔ انشائیے کی خوشگواریت پر ممیائی گئی تحریریں سامنے آنے لگیں۔ نثریات کو بھی شعریات میں ڈھالا گیا۔ کلامی متنی ٹیں ٹیں ہوئیں۔ تحریر سے مصنف کو بارہ پتھر باہر کیا گیا۔ خوخیاتی خردنے نشانیات کو علم کشائی کی اکسیر قرار دیا۔ آدم کی معکوس ارتقائی نے نقل بہ مطابق اصل کے رویے کو فلسفیانہ فکر کی معراج جانا۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست! آدم بو آدم بو کرتے آدم کو صفاچٹ کرنے والے دیووں کو سوسیر، سٹراس، بارت اور جیکب سن کے نام دیئے گئے۔

پاکستانی معاشرے کے ثقافتی سانچوں کے اندر رہتے ہوئے روایتی تہذیبی حرمتوں اور اقداری سلسلوں کی نفی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ مردوں کو اگر اپنی مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے جہاں کئی سنگ ہائے گراں کے بوجھوں کو سروں سے اتارنے کے مرحلے درپیش ہیں وہاں عورتوں کے سروں پر مردوں کے پہاڑوں جیسے بوجھ بھی لدے ہیں۔ ان سے نجات کے رستے سہل نہیں ہیں۔ تاہم اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کی بنائی ہوئی استحصالی چکیوں میں پستی رہیں۔ انہیں ہمہ وقت اپنے احتجاج قلمبند کروانے ہیں۔ یہ احتجاجات ان کے وجودی احوال کے بدولت سامنے آ رہے ہیں۔ عورت کو بہر صورت پدر مرکز

معاشرے میں اپنے وجود کی حفاظت کے لیے جس آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے وہ اپنی کتاب سیکنڈ سیکس میں سیمون ڈی بوائر نے قلمبند کر رکھی ہے۔ مزید بر آں سرمایہ پرست معاشروں میں مزدور اور عورت کے مقدر سانجھے ہیں۔ جب تک سرمایے کے بھوت مجبور اور محکوم آبادیوں پر منڈلاتے رہیں گے مردوں اور عورتوں کو استحصالی شکنجے تنگ کرتے رہیں گے۔

فرانز فینن کی کتاب، ریچڈز آف دی ارتھ کے دیباچے میں ژاں پال سارتر نے لکھا ہے:

(ترجمہ) زیادہ عرصہ نہیں گزرا، زمین پر دو ہزار ملین باشندے تھے: پانچ سو ملین انسان، اور ایک ہزار پانچ سو ملین مقامی۔ پہلے کے پاس علم تھا۔ دوسروں نے اس کا استعمال کیا۔ دونوں کے درمیان دلال تھے مطیع بادشاہ، جاگیردار اور بورژوازی، یہ شروع سے آخر تک دھوکہ باز تھے، یہ مقامی باشندوں اور حکمرانوں کے درمیان گٹھ جوڑ کا کام کرتے تھے۔ کالونیوں میں سچ برہنہ تھا، مقامی شہریوں نے اسے کپڑے پہنائے: مقامی لوگوں کو ان سے پیار کرنا تھا، جس طرح سے ماؤں سے پیار کیا جاتا ہے۔ یورپی اشرافیہ نے مقامی ایلیٹ تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے ہونہار نوجوانوں کو منتخب کیا۔ اور انہیں یورپی ثقافتی نظریات کے آتشیں لوہے سے داغ کر برانڈ میں تبدیل کیا۔

سارتر کا کہنا تھا ہم ایمسٹرڈم اور پیرس میں افریقیوں یا ایشیائیوں کی ایک جماعت کو لائیں۔ چند مہینوں کے لئے انہیں گھمائیں، پھرائیں۔ ان کے کپڑوں اور آرائش وزیبائش کو تبدیل کریں، انہیں آداب اور معاشرتی اطوار بھی سکھائیں اور زبان کے کچھ حصے بھی۔ مختصر یہ کہ ہم انہیں ان کی اپنی تہذیبی اقدار سے عاری کر دیں اور پھر انہیں واپس ان کے ملکوں میں بھیج دیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ایسے اشخاص نہیں رہیں گے کہ جو اپنے دماغ سے سوچیں، فی الحقیقت وہ ہمارے نمائندے ہونگے۔ ہم یہاں انسانیت اور مساوات کے نعرے بلند کریں گے اور وہ ہماری آواز کی گونج افریقہ اور ایشیاء میں سنائیں گے "سانیت" (ساوات)"[۴]

جب میں ۱۹۶۹ء میں اپنا ایم اے کا مقالہ "اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک" قلمبند کر رہا تھا تو میں بھی اسی منطق کے مطابق یہ لکھنے پر قانع تھا کہ:

" ٹیکنالوجی کی ترقی نے تصوف، مذہب اور پرانی مابعد الطبیعیات کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔ انسانی ذات خلا میں معلق ہو کر رہ گئی تھی۔ خارجی اور اجتماعی زندگی میں تشکک اور بے یقینی کا دور دورہ تھا۔ فرد اخلاقی قدروں اور اپنی حیات کے روحانی مسائل سے بے بہرہ ہو چکا تھا۔ جدید مشینی دور نے شہری زندگی کو بہت زیادہ اہمیت بخشی تھی۔ صنعتی شہر خاندانی روابط کے انقطاع کا موجب بن رہے تھے۔ محدود اور معین کے تصورات ملیامیٹ ہو رہے تھے۔ ذہنی افق وسعتوں سے ہم کنار تھا۔ ادب میں موضوعات کی وسعت اور نئے ہیتی سانچوں کو قبول کیا جانے لگا۔ فرد کے دل میں نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر آزادی اور ترقی کی نئی امنگیں متحرک ہوئیں۔ تعلیم و تجارت کی آسایشوں نے سیاحت کو ترقی دی۔ انسان کے سامنے نئے مقامات اور منزلیں آئیں۔ فرد گھر اور خاندان کی اکائی سے بغاوت کرنے لگا تھا۔ گھریلو زندگی تخریبی لہروں میں بہہ رہی تھی۔ غیر ملکی غلامی نے جہاں اجتماعی زندگی کو کھوکھلا بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی وہاں فرد

کی زندگی میں نفسیاتی خلا بھی پیدا کر دیا تھا۔ اس کا اخلاق، اس کے رہن سہن کے قرینے اور تہذیبی زندگی بے قیمت اور بے قامت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ شر، بدی اور سستی جذباتیت کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ جنگ استعماری رویے رنگ و نسل کی کشمکش، طبقاتی تصادم اور پابندیِ فکر و اظہار کے مسائل فرد کو بے اطمینان کر رہے تھے اور بقول ن۔ م راشد اس قسم کی زندگی میں عشق اور فکر دونوں کو تاہ اور کم مایہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ غلامی خواہ فرد کی ہو یا اجتماع کی، غیروں کی ہو یا اپنوں کی، انسان کو داخلی اور خارجی طور پر مربوط اور مجتمع نہیں ہونے دیتی، چنانچہ اس عہد میں فرد کی آزادیِ کامل کے تصورات بھی دیے گئے۔ اس ساری صورتِ حال میں عشق کے تصورات میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ عشق کے نئے ابعاد میں بین الاقوامی، ملکی، معاشی، سماجی اور انفرادی مسائل کو ایک کل کا حصہ سمجھا جا رہا تھا۔ عشق کے یک طرفہ تصورات ختم ہوئے اور ان کی جگہ اس اقلیم میں دونوں روحوں (مرد اور عورت) کی سچی آوازیں سنائی دیں۔"۵

ژاں پال سارتر نے جن نیم یورپی انسانوں کی بات کی ہے وہ آج مکمل یورپی منطق کے تحت رنگا رنگ نظریات کے زور و شور سے پرچارک ہیں۔ ہمارے تمام نظریہ بازوں کی یورپی علمی مسافتوں کے نتیجے میں فروغ پانے والی مناطق متون کی نت نئے شروحات کے گل کھلانے پر زور و شور سے کام کر رہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر علی شریعتی:

"یہ وہ اشخاص تھے جنہوں نے لوگوں کو باور کرایا کہ وہ اپنی دقیانوسیت سے کنارہ کش ہو جائیں، اپنے مذہب کو پس پشت ڈال دیں، مقامی تہذیب سے نجات پائیں (جس میں انہوں نے انہیں جدید یورپی معاشروں سے کہیں پیچھے رکھا ہوا ہے)، سر تا پا مغرب زدہ ہو جائیں۔ تبادلے اور برآمد کے وسیلے سے کسی کا یورپیت زدہ ہونا کیسے ممکن ہے؟ کیا تمدن ایک شے کا نام ہے جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ برآمد کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ کسی مخصوص معاشرے کو چند سالوں میں جدید بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی کوئی فرد بھی مکمل طور پر جدید ہو سکتا ہے کسی یورپی سے بھی جدید آپ اس کے صرف کے پیمانے بدل دیں وہ فوری طور پر جدید ہو جائے گا۔ بس یہی تو چیز ہے جس کی اہل یورپ توقع کر رہے تھے۔ لیکن کسی قوم یا کسی معاشرے کو مہذب بنانا آسان نہیں ہے۔ تمدن اور تہذیب یورپ کا بنایا ہوا ایسا مال نہیں جس کی ملکیت کسی کو مہذب بناتی ہے۔ انہوں نے ہمیں یہ باور کروا دیا کہ جدیدیت کی تمام تر بے ہودگی تمدن ہی کا مظاہرہ تھا اور یوں ہم نے پر شوق انداز سے اپنے حقیقی اثاثوں کو پھینک دیا۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنی معاشرتی عزت، اخلاق اور فکر کی بھی پرواہ نہ کی۔ منشاء یہ تھا کہ اس شے کے پیاسے شیر خوار بن جائیں جسے یورپی ہمارے حلقوں میں ڈالنے کے لئے پر جوش تھا۔ جدیدیت کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔"(۶)

معاصر دور میں فلسفے اور ادب کی خانوں میں تقسیم کا رواج نت نئی درفنطنیاں چھوڑنے اور پروفیسرانہ دکانداریاں چمکانے کا باعث بن چکا ہے۔ آج پوسٹ ماڈرن فکری جستا جستی معاصر انسان کی ضرورت بنا دی گئی۔ ہمارے دانشور مابعد و مابعد و مابعد کا ورد کرتے ہوئے اپنے مقالوں اور مضمونوں میں ورائے جدیدیت کے نام پر جدیدیت کی کھل کھیلنیوں ہی کو رقم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ متن، معنی، ڈیزائن، گرامر، نارسا افکار کی گھمن

گھیریوں نے درسگاہوں اور ادبی فیلسوفوں کو اپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی اور ان کے معتقدین نے اردو دنیا کو فکری اور تجزیاتی طور پر "بوندلانے" میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فرانسیسی نظریہ ساز مشل فوکو کی طاقت تفتیشی نے محکوموں کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط اور سخت کر دیا ہے کہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ احساس دلا دیا گیا ہے کہ وہ طاقت کے اصل ماخذ حاکموں کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتے۔ مزدور بارمنت نظام طاقت کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کمر خمیدہ رہے گا۔ طاقت کے باؤلے کتوں نے جو کھیل رچا رکھا ہے اس کے نتیجے میں انسان گزیدگیاں عام ہیں۔ ماحصل یہ ہے کہ انسان، انسان سے بھی ڈرنے لگا ہے کہ ان میں بھی پے بہ پے پاگل پن کے آثار جھلکیاں مار رہے ہیں۔ ایسے میں مردم گزیدہ افراد آئینوں میں اپنی شکلیں دیکھ کر ڈرنے لگے ہیں مبادا کہیں وہ ہی انہیں کاٹ نہ لیں۔۔ اس پاگل پن کی معنی رسی میں ایڈورڈ سعید، فرانز فینن، نوم چومسکی، مشل فوکو، اور میلکم مگریج جیسے نظریہ سازوں کے نام سر فہرست ہیں۔ مابعد و مابعد و مابعد کا ورد کرنے والے ہربرٹ مارکیوز، ایرک فرام اور سارتر، ٹیری ایگلٹن، جیمسن کی جانب کم کم ہی رجوع فرماتے ہیں کہ ان کی وجودیتی مارکسزم اور مارکسی مظہریات مظلوموں اور محکوموں کو زنجیروں کے حلقے توڑنے کا درس دیتی ہے۔ اپنے علامہ اقبال تو ان کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ افتخار جالب نے لسانیاتی حوالے سے اپنی ذیل کی نظم میں بہت کچھ کہا ہے :

اے خوشا بخت کہ امریکہ نے
آداب سفارت کی بحالی کا ارادہ باندھا
ویت نام ایک نئے دور میں داخل ہو گا
صنعت و حرفت و کلچر کی فراوانی میں
کوئی قلت ہے تو بس اتنی کہ
الفاظ کی ناداری ہے!
وہ زباں۔۔ جس میں فرانسیسی جواں
"ہیّاہو۔، ہوچی من وہوچی من وہوچی من وہوچی" گاتے
سارے عالم کے لیے قبلہ امید بنے
منہ لگی شیریں دہن چھٹتی نہیں
ادبدا کر یہی کہہ بیٹھتی ہے: کیسی فراوانی ہے؟
کہ حلقوم تو حلقوم ہے: پابندی میں پاگل سا جگاڑ
امریکی سلینگ ان کے لب ولہجہ ولیر نکس کی ہر بافت کو گھیس کرتا ہے
شیر بکری کے نئے گھاٹ کے دوارے، آرے

ورلڈ آرڈر کے بہیمانہ طلسمات نے ڈیرے ڈارے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے، دیکھیے، مشروم فشن
شیر و شکر ہوتی زبانوں کا بطن، قربت و لاچاری کا لنگوا کچرا
ٹاکسک ویسٹ میں تبدیل کیے دیتی ہے: تا حد نگہ زیست کا کوڑاملبہ
۔۔ہیروشیما کے دم عیسٰی کا ہر لحظہ نیا کن فیکوں!
پھول کھلے، تازہ زباں۔ دید کے فٹ پاتھوں پہ آجایئے سرکار، ادھر دیکھیے
یہ کون جواں، رقص میں گلنار ہی گلنار، تررڑ، ڈز
(زیست کا کوڑاملبہ)(۷)

طاقت کا سرچشمہ حاکموں کے ہتھیار ہیں۔ یہ دیوانے تررڑ ڈز کی زبان کے معنی بیان کرنے میں لاثانی ہیں۔ مابعد یئے نار ساخیالات اور نا قابل فہم نثر کے اس حد تک معتقد ہیں کہ فلسفیانہ متون کے زمرے میں رکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ انہیں جدیدیت کی سچائیاں اور قدریں بوسیدہ لگ رہی ہیں حالانکہ وہ خود اجتماعی لاشعور اور صنمیاتی دبائو کی باتیں کرتے ہوئے دانش کے قدیم بنجری دور کا اعادہ بالخیر کرنے پر ہمہ وقت آمادہ و مائل نظر آتے ہیں۔ جدید روشن خیالی پر ان کے حملے مابعد جدید نو طرزیوں کی مدد سے کیے جاتے ہیں حالانکہ یہ نو طرزیاں بھی قدیم دانش میں موجود جبری کیف و کم ہی کے عکوس کی نقول معلوم ہوتی ہیں۔ متون میں معنی کے عدم استحکام کا تصور اور ابلاغیاد ھورا پن مابعد جدیدی نظریہ سازوں مثلاً ژاک ڈریڈا، مشل فوکو اور ژاک لاکاں کے لیے معیوب نہیں ہیں۔ تو کیا جدید متون مثلاً جیمز جوائس کا ناول یولیسس، ایذرا پائونڈ کے کینٹوز اور ٹی ایس ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ معنی کے عدم استحکام اور ابلاغی ادھورے پن سے متصف نہیں ہیں؟ اس سلسلے میں قدیم شاعر میر بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے اشعار کئی کئی طرفیں رکھتے ہیں(۸)۔ استعاراتی اور علامتی اظہار میں موجود طرفیں قدیم و جدید اور مابعد جدید کیٹیگریز میں یکساں و مماثل ہیں۔ غالب کی مشاہدہ حق کی گفتگو میں بادہ و ساغر کہے بغیر بات کہاں بنتی تھی۔(۹)

حوالہ جات و حواشی

1۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی، دیوان غالب، انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۱

2۔ تو و طوبیٰ و ما و قامت یار۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست،

حافظ شیرازی، دیوان، غزل ۱۸، تہران، ۱۹۷۱ء، ص ۲۹

3۔ ایک تشکیل

4۔ Frantz Fanon Wretched of the Earth, Grove Press, New York, 1963,P.7

(ترجمہ راقم الحروف)

NOT so very long ago, the earth numbered two thousand million inhabitants: five hundred million men, and one thousand five hundred million natives. The former had the Word; the others had the use of it. Between the two there were hired kinglets, overlords and a bourgeoisie, sham from beginning to end, which served as go-betweens. In the colonies the truth stood naked, but the citizens of the mother country preferred it with clothes on: the native had to love them, something in the way mothers are loved. The European élite undertook to manufacture a native élite. They picked out promising adolescents; they branded them, as with a red-hot iron, with the principles of western culture.

5۔ سعادت سعید، اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۹

6۔ ڈاکٹر علی شریعتی، تہذیب، جدیدیت اور ہم، ترجمہ سعادت سعید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۶۸۔۶۹

7۔ افتخار جالب، یہی ہے میرا لحن، نظم "زیست کا کوڑا ملبہ"، فرہنگ، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۹

8۔ طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم، میر تقی میر، کلیات، منشی نولکشور، لکھنو، س ن، ص ۴۰۶

9۔ دیوان غالب، انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۹۹ء، ص ۴۷